eISSN: 2791-0342
pISSN:2791-0334

غلام عباس کے افسانوں میں تہذیبی شعور

Cultural consciousness in the short stories of Ghulam Abbas

Waheed Ahmad **وحید احمد**

MPhil Urdu Scholar, Lahore Leads University, ایم۔فل اُردو اسکالر، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

Lahore

Abstract:

Literature is a place where all the thoughts and ideas of the world gather. Literature is a reflection of time and environment. It is true that no literature in the world can be separated from its environment. Every writer, author and poet intentionally or unintentionally takes influence from his environment and represents the section of society to which he belongs. Literature takes effect from human life. Literature is a reflection of life, so there are social, political, cultural, economic, artistic and aesthetic aspects in literature because these things bring literature closer to life. Ghulam Abbas has a clear social vision that dominates most of his fiction. In fact, like an actor, a person always plays his role according to his different social and family statuses in his real life. In the fictions of Ghulam Abbas, real and true images of the public life of the middle of the twentieth century are found. In the painting of the atmosphere and atmosphere, he evokes the aspects of public life with great artistic skill. Also, there is hardly any aspect in their atmosphere and imagery that is not related to objective elements.

Keywords Ghulam Abbas,Urdu Language & Literature, Fiction, Cultural Consciousness

اردو افسانے میں حقیقت نگاری کے رجحان سے متاثر ہونے والوں میں "غلام عباس" کی شخصیت بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ غلام عباس کا نام آتے ہی اُن کے افسانے "آنندی" کا نام ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ جس میں ناکامیاب سوچ کی عکاسی کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر گناہ کو شہر سے دور یا انسان سے دور کر دیا جائے تو وہ روپوش ہو جاتا ہے۔ افسانے میں پوری ایک تہذیب سمٹ کر آگئی ہے جہاں نیک نیت نگاہ بانوں کی ظاہری اور باطنی سوچ کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اس میں پورا شہر ایک کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے متعلق غلام عباس رقم طراز ہیں:

> "اس کا خاص وصف یہ ہے کہ اس کی تکنیک عام افسانوں سے الگ ہے اس میں ایک دو یا چند کرداروں کو نہیں بل کہ پورے شہر کو ایک مجسم کردار کی صورت میں رستا بستا اور جیتا جاگتا دکھایا گیا۔"(۱)

غلام عباس کے افسانوں میں زندگی رُکی نہیں ہے بل کہ اپنا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ایک عمل جب اپنا دائرہ مکمل کر دیتا ہے تو زندگی نئے دائرے کا آغاز کر دیتی ہے۔ دائرے کی یہ تکنیک غلام عباس نے اپنے دوسرے افسانوں میں بھی اپنائی ہے۔ غرض یہ کہ غلام عباس کے یہاں فطرت انسانی کی تصویر کشی ملتی ہے۔ حالانکہ انھوں نے بہت کم لکھا لیکن معیار کے لحاظ سے ان کا نام ترقی پسند افسانہ نگاروں کی فہرست میں لیا جاتا ہے۔ غلام عباس نے اپنی کہانیوں میں ایسے ہی گمنام شہروں اور جگہوں کی دل آویز تصویر بھی پیش کی ہے۔ جس میں اُن کے کرداروں کا عکس واضح طور پر ہمارے سامنے نمایاں ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی انسان کا دوہرا چہرہ بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

جاڑے کی چاندنی" غلام عباس کا افسانوی مجموعہ ہے جس میں شامل افسانہ "اوور کوٹ" ان کا بہترین افسانہ ہے جس میں کردار کی دوہری شخصیت ہمارے سامنے آجاتی ہے جو غلام عباس کا خاصہ ہے۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس نے اپنے اوور کوٹ کے اندر اپنی وہ اصلیت چھپا رکھی ہے جس سے ہم اپنے افسانے کے آخر میں روشناس ہوتے ہیں۔ یہ اوور کوٹ جسے وہ پہن کر شان سے چلتا ہے اُس کے ظاہری دکھاوے، تصنع اور فریب کی علامت ہے جس کے نیچے زندگی کی محرومیاں اور اصلیت چھپی ہوئی ہے۔ افسانے میں اعلی طبقے کے خواب دیکھنے والے شخص کا جب اوور کوٹ اُتارا جاتا ہے تو یہ منظر دکھائی دیتا ہے:

> "اوور کوٹ اُتارا گیا تو نیچے سے ایک بہت بوسیدہ اونی سوئٹر نکلا جس میں جا بجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سوئٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آرہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے

جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا۔"(۲)

اس طرح افسانے کے اختتام پر مصنف کی زبانی ادا کیا یہ جملہ کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی اس پر ہنگی نے اسے خجل کر دیا ہے، پوری انسانی شخصیت کو واضح کر دیتا ہے۔ دراصل یہ افسانہ طبقاتی معاشرے میں رہتے ہوئے انسانی خواہشات کی نا آسودگی کے باعث پیدا ہوئی اُس کی ظاہری و باطنی کیفیت کی کہانی ہے۔ جہاں مغربی تہذیب میں خود کو لپیٹ کر ایک شخص گھومتا ہے لیکن یہ ظاہری بناوٹ زیادہ دیر قائم نہیں رہتی۔ غلام عباس کی یہ کہانی سادہ بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ اور اس کا انجام ایک ڈرامائی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جہاں سب حیران و ششدر رہو جاتے ہیں۔

تکنیکی لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کا افسانہ دھنک بھی قابل ذکر ہے جس میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پوری کہانی وجود میں آگئی ہے۔ اس میں کوئی مربوط پلاٹ نہیں ہے۔ اس کا مرکزی کردار معاشرہ ہے جو انسانی پیداوار ہے۔ یہ کہانی افسانہ آنندی سے مشترکہ ہے جس میں معاشرے میں آنے والی مختلف تبدیلیوں کے باعث اُس کی تباہی اور دوبارہ اسی طرح کا معاشرہ پھر پیدا ہو جانے کی کہانی ہے۔ اسلوبیاتی لحاظ سے ان کا افسانہ لچک بھی قابل ذکر ہے جس میں ایک نئی تکنیک کا استعمال ہوا ہے۔ پورا افسانہ خطاب کی صورت میں پیش ہوا ہے۔ افسانے میں ایک سیاست داں کے ذریعے کی گئی اردو افسانے کا موضوعاتی اور اسلوبیاتی مطالعہ تقریر دھیرے دھیرے طنز کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور رفتہ رفتہ آئی یہ تبدیلی سے پورا افسانہ ہی طنز بن جاتا ہے۔

فینسی ہیئر کٹنگ سیلون" اور "تنکے کا سہارا" غلام عباس کے افسانوں کے دوسرے مجموعے "جاڑے کی چاندنی" میں شامل ہیں۔ "فینسی ہیئر کٹنگ سیلون" میں کہانی اس انداز سے شروع ہوتی ہے کہ تقسیم ہند کے دوران چار مہاجرین دیار غیر میں پہنچ جاتے ہیں۔ چاروں مہاجرین حجام ہیں اور انھیں حکومت کی طرف سے ایک دکان مہیا کرائی جاتی ہے جسے ایک ہندو نائی نے بٹوارے کے پر آشوب زمانے میں چھوڑ دیا تھا۔ غریب مہاجرین مفت دکان ملنے کے بعد اپنی اپنی معاشی حالت کو بحال کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگتے ہیں:

"سب سے پہلے ان لوگوں نے بازار سے ایک کوچی اور چونا لا کر خود ہی دکان میں سفیدی کی اور اس کے فرش کو خوب دھویا پونچھا۔ اس کے بعد نیلام گھر سے پرانے انگریزی کپڑوں کے دو تین گٹھر سستے داموں میں خریدے، ان میں سے قمیضوں اور پتلونوں کو چھانٹ کر الگ کیا۔ پھٹے کپڑوں کو سیا۔ جہاں جہاں پیوند لگانے کی ضرورت تھی وہاں پیوند لگائے۔ جن حصوں کو چھوٹا کرنا تھا ان کو چھوٹا کیا اور یوں ہر ایک نے اپنے لیے دو دو تین تین جوڑے تیار کر لیے۔"(۳)

افسانہ نگار نے اس کہانی میں بھی "آنندی" اور باقی افسانوں کے مانند معاشرتی و معاشی مرکز کے ارتقائی مراحل کو اسلوب کی فنکارانہ حسن وخوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں بھی عباس نے کرداروں کی ذہنیت کی گہرائی میں اترنے کے بجائے ان کے سطحی و فعلی کیفیتوں کی نقاشی پر اکتفا کیا ہے۔

"تنکے کا سہارا" پلاٹ اور موضوع دونوں کے لحاظ سے "فینسی ہیئر کٹنگ سلون" سے مماثل ہے۔ کہانی کی ابتدا میں ایک سید کا انتقال ہوتا ہے۔ محلے کے باشندے دینی اور مذہبی عقیدت سے سرشار ہو کر سید کے وارثوں کی مدد کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ محلے کا ایک گاڑی بان اپنے چھکڑے میں ٹال کے لیے لکڑیاں لادا کرتا تھا۔ وہ ان امدادی افعال کے باعث سیدانی کے کرائے کا مکان اچانک محلے کے تمام باشندوں کے لیے معاشی ومالی مرکز کا رتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ ان تمام افسانوں میں ان حقائق کی طرف نشاندہی ملتی ہے کہ انسان کے لیے اپنا اقتصادی ومالی شعور اجتماعی زندگی میں عملی حصہ لینے کا ایک اہم محرک بنتا ہے اور وہ انسان کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط وپیوستہ کرنے اور مشکلات ومصائب کا سامنا کرنے کا حوصلہ عطا کر دیتا ہے۔

اس طرح غلام عباس "بھنور" میں حاجی اور بہار کے تعلقات کے ذریعے ان کے معاشرتی و خانگی رول کے نامیاتی شعوروں کو نمودار کرتے ہیں۔ حاجی نے ناگہاں سانحے کے باعث اپنے اہل وعیال کو گنوا دیا تھا۔ وہ اب ایک طوائف بہار کو گھر میں پناہ دیتا ہے اور اس کا نام بلقیس بیگم میں بدلتا ہے۔ چند ہی دنوں میں بلقیس اپنی خدمت گزاری وسعادت مندی سے حاجی کا پورا اعتماد حاصل کر لیتی ہے۔ وہ شریف گھرانے کی لڑکی کے مانند نظریں نیچی کر کے اس کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آتی ہے اور حاجی کو بھی اس سے پدرانہ الفت ومحبت محسوس ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس حاجی اور بلقیس کے نفسیاتی تانے بانے کو خارجی سطح پر لا کر آپس میں مدغم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"دو تماشے" میں ایک انسان کے ظاہر و باطن کے تضادات کو فن کارانہ دانائی وفکر انگیزی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ مرزا برجیس قدر طبعاً شفیق وحلیم طبع انسان ہونے کے باوجود اپنے خاندانی وقار وعزت کی نمائش کے لیے لوگوں کے ساتھ رعب دبدبہ اور ہتک آمیز سلوک سے پیش آتا ہے۔ دراصل اپنے خاندانی تنزل کے خیال واحساس نے اس کے ظاہری رویوں میں سخت گیری اور نمائش پسندی کا اضافہ کر دیا ہے۔ چناں چہ وہ غریبوں کے سامنے بے رحمانہ وتحکمانہ رول ادا کرنے کے باوجود دل ہی دل میں اپنی ناموافق ونازیبا حرکتوں کا محاسبہ کرتا ہے اور وہ خود اپنی اصلیت اور معنوی رول کے درمیان ذہنی کشمکش کے شکنجے میں پڑا رہتا ہے۔

"سمجھوتا" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انتہائی مشکلات ومصائب میں انسان اپنے نفس کی حفاظت کے لیے خود فریبی سے کام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں ہیرو کی بیوی ایک دن گھر سے بھاگ نکلتی ہے۔ چند دنوں تک مرکزی کردار اپنے دوست وعزیز کے سامنے اپنی عزت

نفس کی خاطر خاموشی و بردباری اختیار کر لیتا ہے۔ مگر اپنی کھوئی ہوئی خوشیوں اور مسرتوں کو یاد کرتے ہوئے وہ بہت جلد ذہنی و نفسیاتی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو شدت غم اور تحقیر واذیت کے احساس سے محفوظ کرنے کے لیے گرد و پیش کے حقائق سے منہ پھیر لیتا ہے۔ چناں چہ جب اس کا نفسیاتی تناؤ و کشمکش حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو وہ عیاش کا نقاب پہن کر نہایت اشتیاق وانہماک کے ساتھ بازار حسن کا چکر لگانے لگتا ہے:

> "اس کے بعد اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ پہلے پہل اسے اس کوچے میں جانے کے لیے دوستوں کی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی مگر چند ہی روز بعد دوست اسے اپنی راہ میں حائل معلوم ہونے لگے۔ چناں چہ وہ اکیلا ہی شب گردی کے لیے نکلنے لگا۔ پہلے گھوم پھر کر ساری منڈی کا جائزہ لیتا، مال کو پرکھتا اور پھر اپنا پسند کیا ہوا دانہ ایک شوقین مزاج رئیس زادے کی طرح منہ مانگی قیمت پر خرید لیتا۔ رفتہ رفتہ اسے عیش پرستی کا ایسا چسکا پڑ گیا کہ دفتر سے اٹھ کر شاذ ہی کبھی گھر پہنچتا۔ آج اس کوٹھے پر ہے تو کل اس بالا خانے پر، جھوٹی محبتیں جتاتا اور خود بھی جھوٹی محبتوں سے لطف اٹھاتا۔" (۴)

جب اس کی بیوی گھر لوٹ آتی ہے تو پہلے پہل وہ اس کے ساتھ بے اعتنائی ولاپرواہی سے پیش آتا ہے۔ مگر آئے دن کی عیاشی و بے راہ روی سے پیسوں کی قلت ہوتی ہے تو اس کا دل از سر نو اپنی بیوی کی خوش نمائی و دل فریبی کی طرف راغب ہوتا ہے:

> "یہ سچ سہی کہ میری بیوی باعصمت نہیں لیکن آخر وہ عورتیں بھی کون سی عفیفہ ہیں جن کے پیچھے میں قلاش ہو گیا اور جن سے ملنے کے لیے میں آج بھی تڑپتا رہا ہوں۔" (۵)

ہر چند کہ وہ پھر سے ازدواجی زندگی میں قدم رکھ دیتا ہے، لیکن وہ اپنے اقدام کو محض جنسی و فاحشانہ تکمیل اور تسکین سے ہی ہم کنار کر لیتا ہے اور وہ آخر تک اپنے ڈرامائی نقاب کو اتارنے سے قاصر رہتا ہے کچھ انسان ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی اصلیت کو زمانے سے چھپانے کے لیے جھوٹا نقاب پہن کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ "فرار" میں سرفراز اپنی حساس مزاجی و سنجیدہ مزاجی چھپانے کے لیے لوگوں کے سامنے خود کو خوش خلق وملنسار اور ظرافت پسند انسان کے روپ میں دکھاتا ہے۔ لیکن بستر مرگ میں اس کی فطرت سخت مزاجی و تنہائی پسندی کی صورت میں نمو ہوتی ہے۔ "اوور کوٹ" میں اوور کوٹ کا نوجوان سرمایادارانہ نظام کے ظلم و جبر کو متواتر سہنے کے رول میں زمانے کے سامنے تن تنہا اپنا جھوٹا رول ادا کر دیتا ہے۔ اصل میں وہ ایک مفلس و غریب انسان ہے۔ مگر وہ میلے کچیلے بنیان اور بوسیدہ سویٹر کے اوپر عمدہ نفیس اوور کوٹ پہن کر خود کو امیر انسان دکھانے کی سعی کرتا ہے:

"ملکہ کے بت کے قریب پہنچ کر اس کی حرکات و سکنات میں کسی قدر متانت پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنا رومال نکالا جسے جیب میں رکھنے کے بجائے اس نے کوٹ کی بائیں آستین میں اڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرتا کہ کچھ گرد جم گئی ہو تو اتر جائے۔ بت کے آس پاس کے لان کے ایک گوشے میں کچھ انگریز بچے ایک بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے، وہ رک گیا اور بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ بچے کچھ دیر تو اس کی نظروں سے بے پروا کھیل میں مصروف رہے۔ مگر جب وہ تکے ہی چلا گیا تو وہ رفتہ رفتہ شرمانے سے لگے اور پھر اچانک گیند سنبھال ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔"(۶)

وہ عارضی و وقتی طور پر اپنی کڑوی زندگی کو بھلانے کے لیے بہروپ دھارتا ہے۔ احساسِ برتری کے نشے میں مزید چور ہونے کے لیے وہ غرباء کی عزت و حرمت سے کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے۔ پان والے کے مانند شہر کے تمام لوگ اوور کوٹ کے نوجوان کے سامنے ضمنی کرداروں کی حیثیت سے رول ادا کرتے ہیں اور ان کا وجود نوجوان کی اداکاری کی تکمیل کے لیے لازمی ہے۔

غلام عباس نے اپنے افسانوں میں کہانی کے مرکزی موضوع سے ہٹ کر کوئی بات اٹھا نہیں رکھی ہے۔ اس افسانے میں وہ موثر و مدلل ڈھنگ سے سماج کے دو متضاد و منقسم طبقوں کے تلخ حقائق کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایک طبقہ وہ ہے جو غرباء کا خون چوس کر اس ظاہری رونق میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے۔ دوسرا طبقہ غرباء کا ہے جو دنیا کی چمک دمک کو امیروں تک پہنچانے کے لیے خون پسینہ ایک کر دیتا ہے۔ غریب لوگ ریستوران کے باہر کھڑے ہو کر چند لمحوں کے لیے امیروں کے ذوق و شوق سے مسرور و پر کیف ہوتے ہیں۔ اوور کوٹ کا لڑکا اب امیر زادے کا رول ادا کر رہا ہے۔ اسی لیے اسے اپنی عزت نفس کے مارے ان لوگوں کے ساتھ میوزک سننا گوارا نہیں۔ اس کے اگلے سین (Scene) میں اس کا انگریزی موسیقی کی دکان میں بلا تکلف قدم رکھنا اسی نفسیاتی رد عمل کا نتیجہ ہے۔ غلام عباس کے دور میں خصوصاً بوارے سے قبل امراء و غرباء دو طبقوں کی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ عوام کو خود کو سجا سنوار کر باہر گھومنے پھرنے کی استعداد مطلق نہ تھی۔ مگر ہمارے دور میں، یعنی اکیسویں صدی کے ہندوستان میں متوسط طبقے کے لوگوں میں چھٹی کے دن اپنے آپ کو سنوار کر Window Shopping کرنے کا چلن عام ہو چکا ہے۔ چنانچہ "اوور کوٹ" کی کہانی غلام عباس کے دور کے سماجی نقطۂ نظر کے لحاظ سے غیر حقیقی و نا قابل یقین ہونے کے باوجود اس کے مرکزی کردار میں ہمارے زمانے کے نوجوانوں کی سی خصوصیت صاف جھلکتی ہے۔ اس کے سبب اس کردار کا انوکھا پن ہماری نگاہوں میں کسی قدر ماند پڑتے ہوئے دکھائی دیتا ہے:

"اس اثنا میں ایک نوجوان جوڑا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل گیا۔ نوجوان کے لیے جواب ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، یہ نظارہ خاصا جاذب نظر تھا۔ وہ جوڑا کچھ دیر تک تو خاموش چلتا رہا۔ اس کے بعد لڑکے نے کچھ کہا جس کے جواب میں لڑکی اچانک چمک کر بولی:

ہر گز نہیں، ہر گز نہیں، ہر گز نہیں۔"

سنو میرا کہنا مانو" لڑکے نے نصیحت کے انداز میں کہا۔ ڈاکٹر میرا دوست ہے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔"

"نہیں نہیں نہیں۔"

"میں کہتا ہوں تمھیں ذرا تکلیف نہ ہو گی۔"

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔

"تمھارے ماں باپ کو کتنا رنج ہو گا۔ ذرا ان کی عزت کا بھی تو خیال کرو۔"

"چپ رہو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔"(۷)

جوڑے کے اداکارانہ مکالموں سے نوجوان بے ساختہ متاثر ہوتا ہے، حالاں کہ ان کی گفتگو میں حقیقی زندگی کا جو رنگ و بو جھلکتا ہے وہ قطعاً اس مصنوعی و ڈرامائی فضاؤں سے موافقت نہیں رکھتا ہے۔ جوڑے کے مکالموں سے مرد و زن دونوں کے فطری و ازلی رشتے بے نقاب دکھائی دیتے ہیں مگر ان دونوں کا تعاقب کرتے ہوئے دفعتاً ایک لاری سے مرکزی کردار کا حادثہ ہو جاتا ہے اور اسے ہسپتال کے شعبہ حادثات میں پہنچا دیا جاتا ہے:

"آپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے جنھوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کا سارا حصہ چھپا رکھا تھا، اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے، اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔"(۸)

مصنف علامتاً ڈاکٹر اور نرسوں کے نقابوں سے قارئین کے سامنے اس حقیقت کو اجاگر کر دیتے ہیں کہ اگرچہ انسان ایک دوسرے کی ظاہری صورت اور اطوار و اقوال کو اس کی مکمل شخصیت کا آئینہ دار سمجھتا ہے، مگر اس کی رسائی کسی دوسرے انسان کی اصلیت تک بھی نہیں ہوتی ہے۔

"اس کی بیوی" میں غلام عباس نے ایک طوائف کی خوابیدہ فطرت و جبلت کو بیدار ہوتے ہوئے اور اسے اس بیداری کے نتیجے میں اپنی سماجی اداکاری سے فائق و بالاتر ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ "اس کی بیوی" ایک نوجوان لڑکا اور ایک طوائف نسرین کی کہانی ہے۔ کہانی کے بیشتر

واقعات نسرین کے کوٹھے کے اندر ہی واقع ہوتے ہیں۔ غلام عباس نے شعوری وارادی طور پر ڈرامہ نگاری کے عناصر سے افسانے کی فضا بندی کی ہے اور اس متعین ومقرر مقام میں کرداروں کے معاشرتی شعور واحساس اور داخلی کشمکش کو کھل کر ظاہر کیا ہے۔ ایک نوجوان لڑکا نسرین کے کوٹھے میں گاہک کی حیثیت سے قدم رکھتا ہے۔ لڑکا اس لیے یہاں آیا ہے کہ نسرین شکل وصورت میں اس کی مرحومہ بیوی نجمہ سے ملتی ہے۔ دوران گفتگو وہ نسرین کو اپنی بیوی کی یادیں ہی سناتا ہے اور وہ نجمہ کی عادات و خصائل اوراپنی ازدواجی زندگی کے تمام اہم واقعات سے اسے روشناس کرادیتا ہے۔ خلاف توقع کوٹھے میں ایک گاہک کی زبان سے اس کی بیوی کی متواتر تعریفیں سننے سے نسرین کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے اور اس کی پریشانی طنز و تشنیع کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔:

"میری بیوی۔۔۔۔"

"تو گویا بہت محبت تھی آپ کو بیگم صاحب سے۔ بالآخر نسرین نے بات کاٹ کر کہا۔ جب ایک آدمی بولے ہی چلا جائے تو دوسرا کب تک چپ رہ سکتا ہے۔" بے حد" بے ساختہ نوجوان کے منہ سے نکلا ۔ وہ اس کے طعن کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ "مگر صاحب آپ کی باتیں بھی عجیب ہیں۔" ایک انتقامی جذبہ اس میں بیدار ہو رہا تھا۔ "سمجھ میں نہیں آتا وہ کیسی محبت تھی جو اس کے مرنے کے تین ہی مہینے میں رفو چکر ہو گئی، اوراب۔۔۔"(۹)

لڑکے کی غیر موجودگی کے باعث نسرین کے دل میں بے چینی و بے قراری بڑھ جاتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے نوجوان پر چوری کا شک کرنے سے وہ اپنے تئیں نادم وشرمندہ ہو جاتی ہے، کیوں کہ اب اسے اپنے پیشہ وارانہ نکتہ نظر سے سخت نفرت وعداوت ہو چکی ہے۔ اتنے میں لڑکا ، منڈی سے گوشت اور ترکاری لے کر آتا ہے۔ وہ کل تک نسرین کی ذات میں نجمہ کی شخصیت و کردار کا عکس کھوج رہا تھا۔ آج وہ اس کے ساتھ اصلی شوہر کے مانند پیش آتا ہے، کیوں کہ وہ نسرین کے ساتھ عارضی وقتی رشتے کے ذریعے اپنی ناآسودگیوں اور محرومیوں کی تشنگی کو بجھانا چاہتا ہے ۔ لیکن نسرین کے اندر اب تک نجمہ کی طرح رہنے سے جھجک باقی ہے۔ اسے دونوں کے بیچ میں کسی قدر غربت و بیگانگی کا پردہ حائل ہوتے ہوئے محسوس ہو رہا ہے۔ چناں چہ وہ اپنی پھوپھی سے کہتی ہے:

"خبطی ہے پورا، رات بھر اپنی مری ہوئی بیوی کی باتیں کر کے دماغ چاٹ گیا۔۔۔۔ شمن کو اس کے پاس بھیج دینا، ہاتھ بٹاتا رہے گا۔ میں ذرا نو بہار کے ہاں جاتی ہوں۔"(۱۰)

نسرین اپنے قلبی تغیرات کو پھوپھی کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتی ہے۔ وہ ایک طوائف ہے اور اس کی مخصوص سوسائٹی میں ازدواجی زندگی گزارنے کا خواب دیکھنا مضحکہ خیز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پہلی بار وہ نوجوان سے اس کے متعلق استفسار کرتی

ہے اور اپنائیت کا شعور اس کی غیرت کے حجاب کو یکسر چاک کر دیتا ہے۔ یوں اس کا نفس مکمل طور پر طوائف کے کردار کے خول کو توڑ کر اپنی ابتدائی روپ کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

غلام عباس اپنے افسانے "بہروپیا" میں انسان کے معاشرتی شعوروں کی تہ داری کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک انسان اپنی معاشی واقتصادی ناچاری و مجبوری کی وجہ سے بیک وقت سماج میں مختلف نقاب پہن کر زندگی گزارتا ہے۔ افسانہ "بہروپیا" محض ایک کہانی ہونے کے باوجود انسان کے سماجی شعور کے تنوعات اور بوقلمونی کی کیفیتوں کو عریاں کرتا ہے۔ بہروپیا قلیل سے قلیل صلے کے حصول کے لیے آئے دن اپنا سوانگ بھرتا رہتا ہے۔ مگر قدامت پسندانہ معاشرے کے تنزل و خاتمہ اور مغرب کے نئے اقتصادی نظام کی آمد کے اثرات اس کی زندگی میں کئی انقلابی پہلو پیدا کر دیتے ہیں۔ بہروپیا کی بستی کے خستہ حال و بوسیدہ مناظر، اقتصادی و معاشی قدروں کے تغیرات کو علامت ظاہر کر دیتے ہیں۔ چناں چہ اس افسانے میں ایک غریب و نادار بہروپیا بھی اپنے اہل و عیال کا پیٹ بھرنے کے لیے اپنے ہنر کو نئی سماجی قدروں کے سانچے میں ڈھالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ ہر فن مولا ہونے کی بدولت ہر طرح کے کاموں کو نہایت سلیقے سے نپٹا دیتا ہے اس افسانے کے مرکزی کردار کو غلام عباس نے یوں پیش کیا ہے:

> "ہم نے کوئی پندرہ بیس منٹ انتظار کیا ہو گا کہ ٹاٹ کا پردہ پھر سرکا اور ایک نوجوان آدمی ململ کی دھوتی کرتا پہنے بیٹیاں جمائے، سر پر دو پلی ٹوپی ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھے جھونپڑے سے باہر نکلا، بوڑھے مہاجن کی سفید مونچھیں غائب تھیں اور ان کی بجائے چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں اس کے چہرے پر زیب دے رہی تھیں۔
> "یہ وہی ہے۔" یک بارگی مدن چلا اٹھا۔ "وہی قد، وہی ڈیل ڈول۔" (۱۱)

غلام عباس ہیروئن کی ذات کے حوالے سے اس حقیقت واصلیت کا اعادہ کرتے ہیں کہ انسان کی شخصیت کی تکمیل اکتسابی طور پر ہوتی ہے، نہ کہ پیدائشی۔ چناں چہ اس کی داخلیت کی تشکیل میں بیرونی و خارجی اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بردہ فروش کی سرغنہ مائی بھی اسے لینے کے لیے آتی ہے تو وہ اپنے ماضی کو الوداع کرنے کے لیے اسے مار پیٹ کر بھگا دیتی ہے۔ لیکن اس کا یہ آرام و سکون بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ ریشماں کا پہلا شوہر کرم دین اس کی تلاش میں چودھری کے گاؤں تک پہنچ جاتا ہے اور وہ ریشماں کا بھانڈہ پھوڑ دیتا ہے۔ مذاکرہ و مباحثہ کے بعد دونوں مردوں میں یہ طے ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑیں اور جو جیت پائے گا وہ ریشماں کو حاصل کر لے گا۔ چناں چہ چودھری، کرم دین اور ریشماں تینوں جنگل کا رخ کرتے ہیں:

"ریشماں چلتے چلتے تھک گئی۔ وہ ان سے ذرا فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھ گئی، اس کے چہرے پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ دلچسپی سے ان کی لڑائی دیکھنے لگی۔ ایسا منظر اس نے اپنی عمر میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے دل میں اب ذرہ بھر خوف باقی نہ رہا تھا، نہ اس کی فکر تھی کہ ان دونوں میں سے کون فتح یاب ہو کر اس کی قسمت کا مالک بنتا ہے۔"(۱۲)

"پتلی بائی" میں عشق کے جذبات اور جسم کی بالیدگیوں کے ارتقائی منازل پر بحث کی گئی ہے۔ اس کہانی میں ایک کم سن لڑکے کو ایک حسین و جمیل اداکارہ پتلی بائی سے والہانہ عشق ہوتا ہے۔ بڑا ہونے کے بعد لڑکے کا وصال پتلی بائی سے ہوتا ہے۔ چوں کہ لڑکپن میں جسمانی طور پر عشق سے لطف اندوز ہونے سے قاصر ہے، اس لیے اسے معشوقہ کے حسن و جوبن اور بے اعتنائی و بے نیازی سے مبہم سی لذتیں حاصل ہوتی تھیں۔ مگر بلاغت کی منزل تک پہنچنے کے بعد اسے یک لخت جسمانی لطف و سرور سے آشکار ہوتا ہے۔ فطرت و جبلت کی بیداری کے ساتھ ساتھ وہ ایک لمحے میں عشق کے جذبات کا پورا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔ بچپن میں وہ جن مفہوموں سے ناآشنا تھا اب وہ ان کے حصول کے ذریعے نفسیاتی ادھورے پن کو پُر کرنے کی سعی کرتا ہے۔

غلام عباس کے جستہ جستہ افسانوں میں پلاٹ کی تعمیر و تزئین کے لیے شعور کی رو (Stream of Consciousness) کی تکنیک کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس میں متحرک بیانات کے ذریعے قارئین کو افسانے کی باطنی و نفسیاتی دنیا کی غیر محدود و بے کراں وسعت کا احساس دلایا جاتا ہے۔ "فرار" میں کہانی کے راوی کو اپنے ماموں سے ملنے کی وجہ سے بے ساختہ اس کے ماضی کی یادیں میں ستانے لگتی ہیں اور وہ اپنی یادوں کے متواتر بیانات سے کہانی کو انتقام تک پہنچا دیتا ہے۔ چناں چہ کہانی کے واقعات کے بیشتر حصے راوی کی یادداشتوں پر مشتمل ہیں۔ مگر اکثر اوقات عباس کے یہاں کردار کے شعور کے بہاؤ کا مظاہرہ کم نظر آتا ہے۔ دراصل اس بات سے متفق ہیں کہ شعور کی بے ترتیب و غیر منظم پیش کش کے باعث پلاٹ کے بارے میں متعدد بھراؤ اور پراگندگی کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ چناں چہ وہ اس تکنیک سے مدد لینے کے بجائے کرداروں کے اعمال و افعال کے پردے میں اشارتی و کنایتی انداز سے شعور گہرائی کی طرف ہلکی سی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ نیز اکثر طور پر اس کے لیے وہ ناموافق تجربات کو کردار کی سماجی زندگی کا محرک بتاتے ہیں۔ سایہ میں وہ سبحان کے ساتھ گزرے ہوئے سانحہ کے بیان کے ذریعے قارئین کو اس کی ذہنی جہتوں سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ جب سبحان وکیل کی بیٹی کی قلبی واردات سے آشکار ہوتا ہے۔ جوانی میں اس پر بھی ایسی کیفیت گزری تھی۔

"اس کی بیوی" میں ایک طرف نوجوان لڑکا اپنی مرحوم بیوی کی یادوں کے سہارے جیتا ہے۔ اس لیے ایک طوائف نسرین جو شکل وصورت میں اس کی بیوی سے مشابہ ہے، کی ایک ایک حرکت کو دیکھ کر اس کے دل میں مرحومہ کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف نسرین

کی ذہنی تبدیلیوں کا محرک اس کے بچپن کی کھوئی ہوئی زندگی ہے۔ دونوں کرداروں کی گزرے ہوئے زمانے کی یادیں داخلی طور پر دونوں کو حقیقی زندگی کے سنگم میں متصل کرنے میں مددگار ہوتی ہیں۔

"کن رس" میں ایک ایسے انسان کی نمائش کی گئی ہے جو دل کی تہ میں اپنی خواہش کو چھپائے ہوئے زندگی گزار رہا ہے اور وہ اسے دور کرنے کے لیے سماجی قدروں سے انحراف کرلیتا ہے۔ وقتی طور پر پناہ لے کر مدعا حاصل کرنے کی وجہ سے فیاض کے دل میں اپنی فضیلت واولیت کا احساس ہوتا ہے۔

استاد حیدری خاں فورا فیاض کے تحت الشعور کو تاڑ لیتا ہے اور اس کے نفس کو بہت جلد اپنے قابو میں کرلیتا ہے۔ "کن رس" کا موضوع پلاٹ کے خفیف سے تغیرات کے ساتھ "کتبہ" میں بھی ملتا ہے۔ شریف حسین ساجھے کے مکان میں رہنے اور کم تنخواہ حاصل کرنے کے باعث احساس کمتری کا شکار ہو چکا ہے۔ مگر سنگ مرمر کا کتبہ حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے مستقبل کے روشن اور درخشاں خواب وخیال کو سینے میں رکھے ہوئے دفتر میں تگ ودو کرنے لگتا ہے اور اسے اپنی کارکردگی کی بدولت اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنی برتری کا احساس ملتا ہے:

> "ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبہ ہی پر پڑتی ۔امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب بھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا، آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان پیدا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہ لطف وکرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔" (۱۳)

مگر شریف حسین میں معاشرتی رکھ رکھاؤ کا خیال ہر وقت موجود ہے۔ اس لیے وہ فیاض کی طرح اپنے خواب کی تعبیر کے لیے اپنے نفس کو بے قابو وبے لگام ہونے نہیں دیتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی قلبی تشنگی وناپختگی کو دنیا سے پوشیدہ رکھنے کے لیے مذہبیت، اخلاقیات اور انسانیت کا بھرپور سہارا لیتے ہیں اور وہ نمائش پسندی وظاہر داری کے پردے میں مصنوعی برتری وفضیلت کے نشے میں بدمست ہو جاتے ہیں۔ مثلاً "آنندی" میں طوائفوں کے مذہبی شعوروں کا ذکر جگہ بہ جگہ ملتا ہے۔ طوائفوں کو اپنے جنسی کاروبار کے باعث اپنے دل میں گناہوں کا شدید احساس ہے۔ وہ اپنی کرتوتوں اور خطاؤں کو چند لمحوں کے لیے فراموش کرنے کے لیے دولت کے بے تحاشہ صرف کے بل بوتے پر اپنے عقائد کا دھوم دھام سے مظاہرہ کر دیتی ہیں۔ جیسا کہ اس سے قبل لکھا جا چکا ہے کہ 'اندھیرے میں' میں بھی مرکزی کردار اپنی نسلی وخلقی عادات کو چھپانے کے لیے لاشعوری طور پر راسخ عقیدہ انسان کا نقاب پہن کر زندگی گزارتا ہے۔ لیکن ایک حقیقت ہے کہ ہماری عام سوسائٹی میں اکثر لوگ یہی مسلک اختیار کرلیتے ہیں اور وہ اپنی ظاہریت کے خول سے زمانے کو چکما دیتے ہیں۔ "غازی مرد" میں کہانی کی ہیروئن چراغ بی بی نابینا ہے۔ دراصل شادی سے

پہلے اس کے گھریلو ماحول اور جسمانی عیوب نے اسے مذہب و دین کی طرف رجوع ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ چناں چہ زاہدانہ و درویشانہ زندگی اور عبادت گزاری اس کی حیات کا محور ہے۔ وہ دنیاوی معاملات سے مکمل طور پر نا آشنا و ناواقف ہے اور آنکھوں سے معذور ہونے کے باعث اس کے خیالات و تصورات بھی نہایت محدود و تنگ ہیں۔ نکاح کے بعد بھی وہ رات بھر چارپائی کے پاس بیٹھ کر اپنے نیک نفس شوہر علیا کے پاؤں دابتی رہتی ہے اور وہ صبح کو عبادت میں مشغول ہوتی ہے:

> "صبح کو جب علیا بیدار ہوتا تو چراغ بی بی اس سے پہلے جاگی ہوتی اور آنگن میں وضو کرنے یا کوٹھری میں نماز پڑھنے میں مشغول ہوتی۔ وہ نماز کے الفاظ اس طرح ادا کرتی جیسے کوئی سرگوشی کر رہا ہو۔ خاص طور پر آخر کے دعائیہ فقرے علیا کو صاف سنائی دیا کرتے:
> "یا پاک پروردگار! اپنے حبیب کے صدقے میں اس اندھی محتاج کے سر کے سائیں کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھ۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے اس کے سب دشمنوں کو نیچا دکھا۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے اسے ہر بلا سے بچا۔ یا پاک پروردگار میری دعا قبول کر۔ پہلے میں مروں بعد میں وہ مرے۔ آمین۔(۱۴)

علیا کے متعلق چراغ بی بی کے خیالات غیر حقیقی و مافوق الفطری ہیں، کیوں کہ اس کی تمام سوچ بچار کا دائرہ اس کی عقیدت پر دار و مدار ہے۔ اتنے میں ایک واقعہ پیش آتا ہے۔ ایک دن گاؤں کی ایک شوخ اور چنچل لڑکی رحمتے چراغ بی بی کو علیا کے بارے میں تاتی ہے۔

غلام عباس کے افسانوں میں عام آدمی کی زندگی اس کا رہن سہن اور طرز معاشرت بھرپور دکھائی دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ غلام عباس کے افسانوں میں حقیقت کا گمان ہوتا ہے ان کے ہاں تہذیبی شعور کو ہر طرز میں پیش کیا گیا ہے جس سے نا صرف معاشرے کا چہرہ واضح ہوتا ہے بل کہ زندگی کے ڈھب بھی سلجھانے کی اصلاح ملتی ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ فرمان فتح پوری، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص:۱۱۱

۲۔ غلام عباس، جاڑے کی چاندنی، ابلاغ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۴ء ص:۹

۳۔ ایضاً، ص:۳۱

۴۔ غلام عباس، آنندی، اسکریز پبلی کیشنز، کلکتہ، ۲۰۱۶ء، ص:۹۰

۵۔ ایضاً، ص:۹۲

۶۔ غلام عباس، جاڑے کی چاندنی، ص:۶

۷۔ ایضاً، ص:۸

۸۔ ایضاً، ص:۹

۹۔ ایضاً، ص:۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص:۲۳

۱۱۔ غلام عباس، کن رس، ص:۳۵

۱۲۔ غلام عباس، جاڑے کی چاندنی، ص:۹۴

۱۳۔ غلام عباس، جاڑے کی چاندنی، ص:۱۵۸

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۵۸